تحقیق وتنقید کا فکری تناظر اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا امتزاجی اسلوب

محمد رفیع ازہر

ABSTRACT:

Dr. Jamil Jalbi (1929-2019), in his criticisms, has not only made theoretical arguments on the subject of "Amalgam of Research and Criticism" but in practice laid the foundation for his critical theory "Amalgamative Style". The artistic style of his *History of Urdu Literature* (TARIKH-E-ADAB-E-URDU) can be described as the masterpiece of the creative amalgam of research, criticism, culture and linguistics. From this point of view, Jalbi's Criticisms is the most balanced form of two extremes of traditional research and criticism. Although he calls his style a "New Criticism", it would not be strange to call his style "a modern amalgamation".

He has devised a new way of transcending the traditional style of Criticism in Urdu literature. Studying his criticisms, it turns out that his theoretical and applied criticism are incompatible. He considers research and criticism to be interdependent. Not only he promotes an amalgam of research and criticism, he also emphasizes the integration of non-literary sciences. He believes that a critic should benefit from pure scientific and social studies. The more a critic studies, the more his critical insight will grow. In his view, the research process would be weak without critical awareness, and so would the criticism without meaningful research. He understands that it is important for a scholar to have a thorough knowledge of the Eastern and Western traditions. In fact, over time, even more artistic aspects of Jalbi's Criticism may be revealed.

Key Words:

Dr. Jamil Jalbi, History of Urdu Literature, Criticism, Research, Amalgamation.

تحقیق اور تنقید دونوں عمیق نظری کے متقاضی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اوّل الذکر میں روئے جستجو فن پارے کے خارج سے شروع کیا جاتا ہے جب کہ مؤخرالذکر میں روئے انتقاد فن پارے کے داخل سے شروع ہوتا ہے۔ تاہم صاحبِ نظر اگر واقعی صاحبِ نظر ہو تو اس کے لیے مشکل کیا! فکر و نظر کے کمالات اگر خارج کا تماشا دکھا سکتے ہیں تو وہی کمالات داخل کا جلوہ کیوں نہیں دِکھا سکتے؟

اردو ادب کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تحقیقات اور تنقیدات دو ایسے مختلف شعبہ ہائے علوم وفنون ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں متوازی لیکن مخالف سمت پروان چڑھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو کے نام ور ماہرین نے ان دونوں علوم وفنون کے فصل کو شدت سے محسوس کیا، اس کی خرابیوں کو بیان کیا اور اپنے اپنے انتقادات میں اس فصل کو وصل میں بدلنے کی خواہش کا بار بار اظہار بھی کیا۔ اگر غور کیا جائے تو تحقیق وتنقید کے اسلوبِ جستجو کی انتہاؤں نے خواہ مخواہ ان دونوں کے مابین فاصلہ پیدا کیے رکھا ہے۔ اسی لیے ان کی متحارب شدت آج تک محسوس کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (1929-2019) نے اپنی تنقیدات میں تحقیق وتنقید کے امتزاج کے موضوع پر نہ صرف نظری مباحث کیے ہیں بلکہ عملی طور پر اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ہی امتزاجی اسلوب پر رکھی ہے۔ ان کی تاریخِ ادبِ اردو (جلد اوّل: 1975، جلد دوم: 1982، جلد سوم: 2007، جلد چہارم: 2013) کا فنی اسلوب؛ تحقیق و تنقید، کلچر اور لسانیات کے تخلیقی امتزاج کا بہترین شاہ کار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدات، تحقیق وتنقید کی دو انتہاؤں کا نہایت متوازن روپ ہے۔ اگرچہ وہ اپنے اِس اندازِ بیاں کو ''نئی تنقید'' سے موسوم کرتے ہیں، تاہم اُن کے اِس طرزِ توازن کو ''جدید امتزاجی اسلوب'' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس حقیقت کا اظہار ماہرینِ ادب نے بھی اپنے اپنے طور پر کیا ہے۔ جب ڈاکٹر جمیل جالبی نے دسویں صدی ہجری میں اردو شاعری کا سراغ لگایا اور ان کی پہلی تحقیقی کاوش ''دیوانِ حسن شوقی (1971ء)'' منظرِ عام پر آئی تو ڈاکٹر وحید قریشی (1925-2009) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''جمیل جالبی ایک نقّاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس کتاب سے ان کے مزاج کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے۔ تحقیق و تصحیح کا یہ اہتمام جو انھوں نے کیا ہے، اس کی توقّع کسی نقّاد سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ تحقیق اور تنقید؛ اردو میں اس طرح الگ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں کہ نقّادوں کے نزدیک تحقیق محض ایک میکانکی عمل ہے اور محققین کے نزدیک کسی ادب پارے سے تنقیدی نکات کا اِستخراج دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔''[۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اردو ادب کے تحقیقی وتنقیدی میدانوں میں باقاعدہ الگ

الگ روایات موجود تھیں اور یہ روایات آج بھی موجود ہیں۔ کسی فن پارے کو تنقیدی سطح پر پرکھنے کے لیے تحقیقی لوازمات سے مدد لینا غیر اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح تحقیقی مواد پر نظرِ انتقاد کی روشنی میں تبصرہ و تشریح تحقیق کے حق میں حرفِ زائد خیال کیا جاتا تھا۔ رائج تحقیقی کاموں میں تنقید مفقود تھی اور مروجہ تنقیدات میں تحقیق غائب۔ اسی طرزِ اسلوب اور رجحان کو دیکھ کر ایک دفعہ ڈاکٹر جمیل جالبی کو یہ کہنا پڑا:

> ''ہمارے ہاں ان سب کاموں کو دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ تنقید اور تحقیق دونوں ایک دوسرے سے روٹھی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان سب تحقیقی کاموں کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ محقق کا تنقیدی شعور غیر واضح ہے۔''[۲]

گویا صرف راستے علاحدہ نہ تھے بلکہ تحارب کی صورت بھی بن چکی تھی اور دونوں کے بیچ حدِ فاصل کی دیوار علمی مزاحمت کی صورت پیش کر رہی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں ان دونوں کے بیچ نہ صرف فاصلے کم کرنا ضروری تھا بلکہ انھیں باہم بغل گیر کر کے فکر و فن کو وسعت دینا بھی لازم تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق و تنقید کے امتزاج کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے امتزاج کی فنی کاوشوں سے بہت پہلے ''نیا دور (آغاز : کراچی، سہ ماہی/اگست 1955)'' میں ایسے مضامین لکھے جن سے دھیرے دھیرے ان دونوں فنون کو قریب لانے میں مدد ملی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں: ''تنقیدی شعور وہ عمل ہے جس سے تحقیق کا جوہر نکھرتا ہے اور تحقیقی شعور وہ جوہر ہے جس سے تنقیدی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔''[۳] دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ تحقیق و تنقید کے فنون دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ بہرحال افکارِ جالبی کے مطالعے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تحقیق و تنقید کے اس خلیج کو باقاعدہ پاٹنے والے پہلے نابغۂ روزگار ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ انھوں نے ان دو برساتی نالوں کو ایک دریا کی صورت دی، عملی طور پر اس کام کا آغاز کیا اور فنی امتزاج کا ایک ادبی شاہ کار تاریخِ ادبِ اردو کی شکل میں پیش کیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کو باہم بغل گیر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ اور کیوں ان دونوں کے امتزاج پر زور دیا گیا؟ اس کا جواب، ایک مصاحبے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان الفاظ میں دیا: ''میں تحقیق کو تنقید کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا تنقید کو تحقیق کے لیے۔ جب تک یہ دونوں ایک ساتھ نہیں چلیں گی، اس وقت تک بڑے نتائج برآمد نہیں ہوں گے''[۴] گویا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ اردو ادب میں بڑے نتائج، تحقیق و تنقید کے امتزاج کے بغیر ناممکن ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اردو ادب کے جس حصے پر بھی اپنا دستِ انتقاد رکھا، ایک طرح سے اس کی شیرازہ بندی بھی کرتے گئے۔ چاہے کلچر ہو، تنقید ہو، تخلیق ہو، تحقیق ہو یا اردو لسانیات ہو۔ انھوں نے ہر صنفِ ادب، ہر ادبی فکر اور ہر رجحان میں امتزاجی رنگ پیدا کرنے کی عملی کوشش کی ___ دنیا کے جدید شعبہ ہائے علوم سے استفادہ کیا اور عالمی ادبیات میں اپنی ایک شناخت پیدا کی۔ اگرچہ ان کا زیادہ تر علمی و ادبی کام، ان کی امتزاجی جہت کی ایک واضح دلیل ہے تاہم امتزاج کی اس روایت کا

آغاز اردو ادب میں کچھ عرصہ پہلے ہی ہو چکا تھا اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اُسی روایت کو آگے بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کیا:

> ''جن محققین نے تنقیدی شعور کو استعمال کیا ہے، ان کے ہاں تحقیقی مزاج اور تحریر میں آپ کو ایک روشنی نظر آئے گی۔ یہاں میں حافظ محمود شیرانی اور شیخ چاند کی مثالیں دوں گا۔ ان کے ہاں تحقیق اور تنقید ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ تحقیق میں ہمارے ہاں اکثر ایک ڈھیلے پن کا احساس ہوتا ہے جسے جدید محققین کو زیادہ مربوط اور زیادہ منطقی بنانے کی ضرورت ہے۔''۵

یہاں جمیل جالبی کے امتزاجی نقطۂ نظر اور تحقیق وتنقید کے باہمی التزام کو جدید پیرائے میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آج فنِ تنقید ایک ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ اس لیے اردو کا عام ناقد بھی تنقیدی دبستانوں، ان کے مفاہیم، جدید انتقادی نظریات اور اطلاقی تنقید سے بہرصورت واقف ہے۔ کوئی فن پارہ منصۂ شہود پر آتا نہیں کہ اس کی پرکھ کے لیے انتقادی ہاتھ بڑھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ آج کے ذرائع معلومات نہایت تیز ہیں اور ہر قسم کی معلومات جن میں اسلامی، سائنسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور ادبی علوم وفنون کا تبادلہ بڑی سرعت کے ساتھ لحہ بہ لحہ جاری رہتا ہے۔ عوام وخواص، اکثر اوقات انٹرنیٹ سے جڑے رہتے ہیں جس کے لیے اب کسی انٹرنیٹ کیفے میں جانے یا باقاعدہ کمپیوٹر پر بیٹھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ سمارٹ فون/سمارٹ واچ/ٹیبلٹ اور اُن میں مستعمل نت نئی ایپلی کیشنوں نے علمی روابط کے سہل ترین مواقع پیدا کر دیے ہیں۔ اس لیے نقاد کے لیے کسی بھی تازہ ترین فن پارے کو جانچنا، اس کے مآخذ کا کھوج لگانا، یہ سب کچھ محض ایک نشست کا کام رہ گیا ہے۔

اب ذرا ایک لحہ یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر تین/چار سو سال پہلے کے کسی غیر مطبوعہ اور غیر معروف فن پارے کا تنقیدی جائزہ لینا پڑ جائے تو کتنے انتقادی ہاتھ اس کی طرف بڑھیں گے؟___ شاید ایک آدھ ہاتھ یا وہ بھی نہیں! یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تحقیق وتنقید کو ایک ساتھ لے کر چلنا اور ان دونوں کے امتزاج سے فنی اسلوب پیدا کرنا، نہایت محنت طلب تخلیقی کام ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ جوکھم بڑے شوق سے اٹھایا ہے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی کا یہ اقتباس دیکھنے کی ضرورت ہے:

> ''... تاریخِ ادبِ اردو پر تنِ تنہا کام کرتے ہوئے جب میں سینکڑوں بیاضوں اور مخطوطات کے جنگل سے گزرا تو مجھے اکثر ملا نصرتی کا کلام بھی ملتا رہا جسے میں دوسرے شعرا کے نایاب کلام کی طرح جمع کرتا رہا۔ تاریخِ ادبِ اردو میں نصرتی پر لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ریزہ ریزہ کر کے میرے پاس نصرتی کا اتنا کلام جمع ہو گیا ہے کہ اب نصرتی پر لکھنا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہے۔''۶

کسی جنگل سے کارآمد پھولوں کی شناخت کرنا___ پھر انھیں ایک ایک کر کے چننا___ اور ایک گل دستے کی شکل دینا___ نہایت ذوق ولگن کا متقاضی بھی ہے اور جان جوکھوں میں ڈالنے کا متمنی بھی۔ اب یہ بات عقلِ

محض کا جُز ہو جانی چاہیے کہ جس طرح آج کسی بھی فن پارے کو جانچنے کے لیے اس کے گرد، علوم وفنون کا ایک حصار موجود رہتا ہے، اسی طرح کا ایک علوم وفنون کا حصار تین/ چار سو سال پہلے والے فن پارے کے گرد بھی ہوتا ہو گا۔ اسے آسانی کے لیے ادبی صورتِ حال یا فنی ماحول (Environment) کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا قدیم فن پارے کے علمی حصار تک پہنچنے کے لیے تحقیقی بصیرت کے حامل نقّاد کو ادبی تاریخ کی پُر خار راہوں پر چلنا پڑتا ہے۔ ہر دور کا مزاج سمجھنے کے لیے اُسی معاشرے کا باشندہ بننا پڑتا ہے۔ اُس دور کے علما، فضلا، ادبا اور صوفیا کی محافل میں دیر دیر تک بیٹھ کر ان کی تاثیر لینی پڑتی ہے۔ بادشاہوں کے درباروں کا لطف اٹھانا پڑتا ہے۔ کلچر اور زبان کے ذائقے چکھنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر اس قدیم دور کی ادبی روایت کا ادراک ہو پاتا ہے۔ اس کے بعد ہی اگلے مرحلے یعنی قدیم فن پارے کی جانچ کا آغاز ہوسکتا ہے۔

اب یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین/ چار سو سال پہلے کے فن پارے کی جانچ کے جوکھم کیوں اُٹھائے جائیں؟ خوابیدہ و نیم جاں مخطوطوں کی ناز برداری کیوں کی جائے؟ وہ فن پارہ جو دست بردِ زمانہ ہو چکا ہو، اُسے کیوں دریافت کیا جائے؟ جسے تاریخ کی بے رحم موجوں نے فنا کر ڈالا ہو، اُسے کیوں زندہ کیا جائے؟ یہ ماضی پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ناسٹیلجیا تو نہیں؟ ترقی یافتہ زمانے کو چھوڑ کر، غیر ترقی یافتہ ادوار میں کھوئے رہنا، کہاں کی عقل مندی ہے؟ اگرچہ یہ سوالات؛ سہل پسند طبیعت کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں تاہم مذکورہ سوالوں کا محققانہ جائزہ لینا بہرحال ضروری ہے۔

آج دنیا میں ترقی یافتہ ادب کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ فرانس، امریکہ، برطانیہ، روس، جاپان اور جرمنی وغیرہم وہ خطے ہیں جن سے مشرقی ادب، خاص طور پر پاک و ہند و نے انیسویں اور بیسویں صدی میں بھرپور علمی و ادبی اثرات سمیٹے ہیں۔ اور استفادے کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ خطوں میں ادب کی ایک مضبوط روایت کس طرح قائم ہوئی؟ کس طرح ان کے گلستانِ ادب میں زرخیزی، گھنے پن اور خوشبوؤں نے جنم لیا؟ وہ ماہرینِ ادب جنھوں نے عالمی ادب کا مطالعہ کر رکھا ہے بخوبی جانتے ہیں کہ مغرب کے ادبی ارتقا کے پیچھے، اپنی روایت کے ساتھ سچے من سے جڑے رہنے کی شدید خواہش موجود رہی ہے۔

مغرب نے معاشرتی ترقی کے ہر موڑ پر اپنی ادبی روایت کو نت نئے افکار کی عرقیات سے سینچا ہے، انھیں متنوع فلسفیانہ علوم کے انجکشن لگائے ہیں، جدت کی ویکسین دی ہے اور سماجی و سائنسی علوم کا دودھ، نقد و نظر کی چھلنی سے چھان کر پلایا ہے۔ نتیجتاً؛ ایک صحت مند اور مضبوط علمی روایت نے فنونِ لطیفہ کی متنوع تحریکوں کو جنم دیا اور انھی تحریکوں نے آگے چل کر علم وفن کی ایک سے ایک روایت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بایں ہمہ مغربی ادب کی ترقی یافتہ روایت میں یونانی، عبرانی اور عربی روایات کی گونج آج بھی موجود ہے۔ بہ قول جمیل جالبی آج بھی ''مغرب کی تنقید میں ارسطو ایک خدا کی طرح قائم و دائم ہے اور تنقید کوئی پہلو، کوئی راستہ اختیار کرے، اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں جا سکتی۔'' [۷] گویا مغربی ادب کی ترقی کا راز اپنی روایت سے جڑے رہنے میں مضمر ہے اور ظاہر ہے کہ بہ قول جمیل جالبی ''ماضی کی ادبی روایات سے واقفیت ہی، حال و مستقبل کی ادبی روایات کی بنیاد ہے۔'' [۸]

اردو ادب کی ترقی کے لیے بھی ضروری تھا کہ ادیبوں، نقادوں اور محققوں کو قدیم اردو ادب کی روایت کا کماحقہٗ ادراک ہوتا، تاکہ وہ اپنی روایت سے منسلک رہتے ہوئے جدید افکار قبول کرتے جاتے۔ اس طرح اردو ادب کی روایت کا ارتقا بھی جاری رہتا اور اپنی شناخت بھی قائم رہتی۔ لیکن قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اگر روایت کا نقشہ ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے، نقشے کی ساری سطور مدھم اور ناقابلِ ملاحظہ ہوں تو اِن ناگفتہ بہ بنیادوں پر اردو ادب کی بلند و بالا عمارت کیسے قائم کی جائے؟ اور اپنی شناخت کا مشکل ترین سوال، کس طرح حل ہو؟ یہی وہ بنیادی نکات اور سوالات تھے جنھیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شدت سے محسوس کیا۔ چناں چہ انھوں نے اردو ادب کی مضبوط روایت کی اہمیت کے پیشِ نظر ناقدین کے لیے نئی تنقید (1985) کا نصب العین جاری کیا:

> ''تنقیدی موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے سارے ادب اور اس کی پوری تاریخ کا توجہ اور گہرائی سے مطالعہ کریں بلکہ اس کے اہم و غیر اہم، پہلے اور دوسرے درجے کے لکھنے والوں کی تحریروں سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ وہ نہ صرف قدیم ادب پر نظر رکھتے ہوں بلکہ جدید ادب پر بھی۔ وہ تحریریں جو کل لکھی گئیں اور وہ تحریریں جو آج لکھی جا رہی ہیں، ان سے بھی باقاعدگی سے واقف ہوں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی قوم کی تاریخ سے واقف ہوں بلکہ فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، علمِ زبان و لسانیات اور کلچریات سے بھی واقف ہوں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ دنیا کے ادب میں کیا لکھا جا رہا ہے، کیا تحقیقات ہو رہی ہیں اور سائنس کے اثرات ذہنِ انسانی پر کیا اور کس طرح مرتب ہو رہے ہیں۔ وہ سوانح عمریاں بھی پڑھیں اور سفرنامے بھی۔ پڑھنا ان کا سب سے بڑا مشغلہ ہو۔ ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک غیر زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور اس کے ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہوں۔ مطالعہ ہی وہ عمل ہے جو ذہن کو کشادگی، شعور کو پختگی اور جامعیت عطا کرتا ہے اور جب لکھنے والا قلم اٹھاتا ہے تو اس کا وسیع ذہنی پس منظر اس کے اظہار کو جامعیت، اس کے خیالات کو وسعت اور اس کی تحریر کو وقار عطا کرتا ہے۔''[۹]

مذکورہ بالا اقتباس کی آخری سطور میں اصل مدعا کا اظہار موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ وسیع مطالعے کے لیے وسیع میدان بھی درکار ہونا چاہیے! مذکورہ نصب العین؛ سہل طبیعت ناقدین کے لیے کسی ادبی تازیانے سے کم نہیں۔ بہرحال سالہا سال کے غور و خوض کے بعد جن سوالات نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو بے خود کیا، اُن کے تدارک کا عملی اقدام اُن کی ''نئی تنقید'' کے یہی مشمولات ہیں۔ یہ غور و خوض کا مقام بھی ہے اور فکر و عمل کا میدان بھی۔ جمیل جالبی کی اس فکری جہت کے بارے میں سلیم احمد (1927-1983) رقم طراز ہیں:

> ''انھوں نے اپنی تنقیدوں میں بار بار یہ سوال اٹھایا کہ ہمارا ادب روز بروز بے تہہ اور ہماری تخلیقی سرگرمیاں روز بروز معنویت سے عاری کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟ یہ سوال اور لوگوں نے بھی اٹھایا، مثلاً میں خود پچھلے 14 یا 15 سال سے اس قسم کے کئی سوالات سے الجھا ہوا ہوں لیکن

اُنھوں نے اِسے بہت زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تاریخ کے لمحۂ موجود میں ہماری ادبی صورت حال کے سارے پہلو دو۲ روایتوں کے تصادم سے پیدا ہوئے ہیں۔ مشرقی روایت اور مغربی روایت۔ اِس سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمارا ادب اس وقت تک تخلیقی طور پر زندہ اور توانا نہیں ہو سکے گا جب تک ہم دونوں روایتوں کو پوری طرح نہ سمجھ لیں اور انھیں تسلیم کرنے کی پوری کوشش نہ کریں۔ اپنی تنقید میں اِس مسئلے کو سمجھ لینے کے بعد اُنھوں نے ایسی روایت کی تلاش شروع کی جو اُن کے تحقیقی کام کی صورت میں ہمارے سامنے آئی اور اس کے ساتھ ہی مغربی روایت کی تلاش میں وہ ایلیٹ سے شروع ہو کر ارسطو تک جا پہنچے۔''۱۰

جس طرح بعض ادبا تاریخِ ادبِ اردو کو ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحقیقی کارنامہ سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض ناقدین ارسطو سے ایلیٹ تک کو بھی اسی کا تسلسل خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ(1986-1906) اِسے علم وتحقیق کا کوہِ ہمالہ کہتے ہیں۔۱۱ لیکن درحقیقت یہ دونوں ادبی شاہ کار مشرقی ومغربی روایات کی کماحقہٗ پہچان اور آ گاہی کا ایسا وافر سامان ہیں جو ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی شعور کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اور یہ کوہِ گراں انھوں نے تنِ تنہا صرف اس لیے اٹھایا، تا کہ اردو ادب کی نئی شجر کاری کے لیے، تخلیق کے کاشت کاروں کو ایک وسیع وعریض میدان مہیا کیا جاسکے۔ ایک ایسی زمین جہاں اردو ادب کے چھتنار اور پھل دار درخت پہلے سے موجود ہوں اور جہاں نئی کاشت کاری کے لیے زرخیز رقبہ بھی تیار ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ادب کے مبتدیوں کے لیے محض سرمایۂ ادب اکٹھا نہیں کیا بلکہ انھیں اسالیب کے جدید زاویہ ہائے نگاہ سے بھی روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے تحقیق وتنقید کے امتزاج کو ایک نیا تخلیقی رنگ دیا اور اس کے پس منظر میں کلچر کی نئی معنویت دریافت کی۔ اس ضمن میں پروفیسر سید وقار عظیم (1976-1910) کا درج ذیل اقتباس قابلِ ملاحظہ ہے:

''تحقیق نے مخطوطات کے پردوں میں چھپی ہوئی ان حقیقتوں کا سراغ لگایا جن کے بغیر ادبی روایت کے تسلسل کی زنجیر مکمل نہیں ہوتی۔ تنقید نے ان حقیقتوں کو چھان پھٹک کر ان کا تجزیہ کیا اور ان کے باہمی ربط سے روایت کی اس زنجیر کی تکمیل کی جو بہت سی کڑیوں کا سراغ نہ ملنے کے سبب اب تک ادھوری تھی۔ تنقید کے اس عمل کو زبانِ اظہار ملی تو انشا پردازی نے اپنا کردار ادا کیا اور جو کارنامۂ تحقیق اور تنقید کے باہمی اشتراک سے وجود میں آیا تھا، اس میں تخلیق کی شان پیدا ہوگئی۔''۱۲

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو ارتقائے اردو کی ایک لازوال داستان ہے۔ یہ مضبوط و مستحکم روایت کا وہ کامل نقشہ ہے جس کے تمام رسمی نشانات واضح اور جس کی تمام سطور مکمل ہیں۔ اس نقشے پر اردو ادب کی بلند و بالا عمارت بہ آسانی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ یہ کھوئے ہوؤں کو تلاشنے کا فردوسِ بریں ہے اور یہی قومی کلچر کی تشکیل کا مشکِ عنبریں ہے۔ یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ اردو ادب کی زندہ وتابندہ روایت سے جُڑنے کا آلۂ کار ہے۔ یہ قدیم اردو ادب آخر ہے کیا؟ اس کا جاننا ہر ادیب کے لیے لازم ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر جمیل

جالبی لکھتے ہیں:

''نیا پرانے کے مقابل ہی نیا ہوسکتا ہے۔ اسی لیے نئے کو جنم دینے کے لیے قدیم کا شعور حاصل کرنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ روایت جامد اور غیر متحرک اشیا کے ادراک و محسوسات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو ہر زمانے کے جدید ترین طرزِ احساس اور رویے کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ادبی شعور میں وہی چیزیں زندہ اور تازہ رہتی ہیں جو کسی زمانے کے مخصوص تقاضوں کا کامیاب ترین اظہار ہوتی ہیں۔ ہر دور؛ ہزاروں شاعروں اور ادیبوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے مگر ادبی روایت میں ہر دور کی یہ ہزاروں آوازیں اور تجربے شامل نہیں ہوتے بلکہ صرف وہی تحریریں اور وہی آوازیں روایت بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن میں فن کار نے انسانیت و آدمیت کے ہر اس بنیادی تجربے کو اپنے زمانے کے مختلف اور بدلے ہوئے شعور کے ساتھ قبول کیا ہو۔ گویا روایت صرف جدید طرزِ احساس اور رویوں کے مؤثر ترین لمحوں میں تخلیق ہوتی ہے اور زندہ شعور کو ایک کڑی میں پروتی ہے۔ اس طرح ہر جدید زمانہ اور اس کا جدید شعور روایت کے صحت مند سلسلے میں ایک نئی کڑی بن کر جدیدیت کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔'' ۱۳؎

اب تک کی بحث کا مقصد صرف اتنا تھا کہ تحقیق اور تنقید کو الگ الگ راستوں پر چلانے کی وجہ سے اردو ادب کو جو نقصان اٹھانا پڑا، اس کا احساس جگایا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی بھیڑ اپنے ریوڑ سے جدا ہو جائے تو وہ گڑھے میں گر جاتی ہے اور جنگل میں وہی آدمی راستہ بھولتا ہے جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا ہو۔ قیامِ پاکستان (1947) کے بعد پاکستانی ادبا کی مثال ایسی ہی تھی۔ اپنے قافلے سے بچھڑنے والے ادبا، مغربی ادب کے جنگل میں بھٹک رہے تھے اور اپنی روایت سے جدا ہونے والے ادبا، اپنی تخلیقات کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھے۔ چناں چہ جس نابغۂ روزگار نے سب سے پہلے اس حقیقت کو بھانپا، وہ ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں اردو ادب کی بے ضابطگی و گہنانے کا بار بار ذکر کرتے رہے۔ ان کا ہاتھ ایک ماہر نبض شناس کی طرح ہر وقت ادبی روایت کی کلائی پر رہتا تھا۔ تحقیق و تنقید کی جدائی انھیں کسی صورت گوارہ نہ تھی۔ لہٰذا، وہ اپنی تنقیدات میں اس حقیقت سے بار بار پردہ اٹھاتے رہے۔ اس حوالے سے ان کا درج ذیل اقتباس نہایت توجہ کا طالب ہے:

''عام طور پر نقاد، محقق کو گورکن کہتے ہیں۔ اور محقق، نقاد کو جلد باز اور ناواقفیت کی بنا پر بے بنیاد باتیں لکھنے والا کہتے ہیں۔ محقق کہتے ہیں کہ اگر نقاد تحقیق کی مدد سے حقائق کا ادراک حاصل کر لیتا تو اس کی رائے مستند اور اس کے نتائج درست ہوتے ___ دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ تحقیق کو تنقید سے الگ کرنے سے ہمارے ہاں تنقید میں بے شمار بنیادی غلطیاں در آئی ہیں اور مطالعۂ ادب کو مشکوک بنا دیا ہے۔ تحقیق، تنقید کی مدد کرتی ہے اور تنقیدی مطالعے کو بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ 'نئی تنقید' اسی لیے تحقیق و تنقید کے امتزاج پر زور دیتی ہے۔ صرف تحقیق ایک علمی کام

ہے، جو اُس وقت قابلِ ذکر ہوگا جب اس میں تنقیدی شعور شامل ہو۔ بے تحقیق، تنقید وہ کوڑا کرکٹ ہے جسے پہلی فرصت میں دریا برد کر دینا چاہیے۔ محقّق و نقّاد ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ بہترین صورت تو یہ ہے کہ محقّق و نقّاد دونوں ایک ہی ذات میں جمع ہو جائیں۔ 'نئی تنقید' ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آ سکتی ہے۔ ایز را پاؤنڈ (1885-1972) کا 'محقق نقاد' ہی نئی تنقید کا ترجمان ہوسکتا ہے۔'' ۱۴

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہر ادبی کام کا آغاز ایک منظّم طریقے سے کیا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کا نہایت گہرائی سے ناقدانہ جائزہ لے کر ایک فکری تنقید کی بنیاد رکھی۔ تاکہ اس میں مشرقی و مغربی ادب کی تمام مثبت و زندہ اقدار کا امتزاج ممکن ہو سکے۔ تاکہ اس میں تحقیق و تنقید کا نیا حلیفانہ رنگ ظاہر ہو اور اس کے اطلاق میں تخلیقی اُپج بھی واضح طور پر نظر آئے۔ انھوں نے اپنے اس تنقیدی نصب العین کا نام ''نئی تنقید'' رکھ کر عملی طور پر اسے ہر صنفِ ادب و فکر میں بھی برتا ہے۔ اس نئے انتقادی حربے سے ایک طرف تو گزشتہ نتائج کو زک اٹھانا پڑا اور دوسری طرف جدید نتائج سے اردو ادب کو ایک اعتبار و وقار بھی نصیب ہوا۔ ایک مصاحبے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا دیا گیا یہ بیان قابلِ ملاحظہ ہے:

'' صحیح نتائج اخذ کرنے اور ان تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ تحقیق کے ذریعے اپنی بات کو، فکر کو، واقعات کو، تاریخی حقائق کو پرکھ کر دیکھ لیں۔ جب تک آپ اس عمل سے نہیں گزریں گے، آپ کی بات ہوا میں گرہ لگانے کے برابر ہوگی۔ تحقیق تو صحیح نتائج تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے، سچائی کو تلاش کرنے کے سفر کا نام ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جن ادیبوں نے واقعات و حقائق کو تحقیق کے ذریعے نہیں پرکھا، ان کے نتائج بھی غلط ثابت ہوئے۔ مثلاً پروفیسر احتشام حسین (1922-1972) اردو کے مشہور نقاد ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جو غالبؔ (1797-1869) کے تفکر اور اس کے پس منظر کے بارے میں لکھا تھا کہ 'مہر نیم روز' (1850) سے غالبؔ کی تاریخ سے واقفیت، وسعتِ مطالعہ اور نکتہ رسی کا پتا چلتا ہے۔ حالاں کہ 'مہر نیم روز' سے غالبؔ کے وسعتِ مطالعہ اور نکتہ رسی کا پتا چلانا اس لیے صحیح نہیں تھا کہ یہ کتاب غالبؔ نے اردو سے فارسی میں ترجمہ کی تھی۔'' ۱۵

محولہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کے دو برساتی نالوں کی بے ترتیبی اور بے موسمی نے ایک عرصہ تک غیر یقینی صورتِ حال میں نتائج کی بے نور وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مجبور کیے رکھا۔ بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی: '' تنقید کو تحقیق سے الگ کر دیا جائے گا تو جو نتائج اخذ کیے جائیں گے وہ بھی صحیح نہیں ہوں گے۔ میں نے بساط بھر یہی کوشش کی ہے کہ ہر بات کو پہلے تحقیق کے ذریعے صحیح کر لیا جائے تاکہ پھر جو رائے دی جائے یا جو نتائج نکالے جائیں وہ درست ہوں۔ میں نے اس عمل سے تنقید کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ۱۶ گویا تحقیق و تنقید کے امتزاج کا ایک مقصد اردو فنِ تنقید کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کرنا بھی ہے اور

ظاہر ہے کہ اسی طریقے سے درست نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> ''وہ نقاد جو تحقیق کو اہمیت نہیں دیتے ایسی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن سے ان کی تحریر بے وقعت ہو جاتی ہے۔ تحقیق؛ دراصل تلاش وجستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب آپ نے تلاش وجستجو سے، جسے آپ تحقیق یا ریسرچ کا نام دیتے ہیں، 'صحیح' کو تلاش کر لیا تو پھر آپ جو نتائج نکالیں گے، جو رائے قائم کریں گے اور جو بات اس کی روشنی میں کہیں گے، وہ بھی مستند اور صحیح ہو گی۔''[۱۷]

دراصل صحیح کی تلاش تحقیق کی محتاج ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے، تاکہ فن پارے کو اس کے اصل مآخذ میں رکھ کر دیکھا جا سکے۔ اور اصل مآخذ وہ کلچر ہے جس کی مثبت اقدار اور تخلیقی قوت سے فن پارہ ترتیب پاتا ہے۔ اس لیے ''نقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رائے اور اس کے نتائج کی بنیاد تحقیق پر قائم ہو۔ ورنہ وہ 'کھینچ' کے قیاسی کرتب سے ادب کی پتنگ کاٹنے کے عمل میں اسی طرح مصروف رہے گا جس طرح ہمارے اکثر نقاد مصروف ہیں۔''[۱۸] تحقیق سے تعرض برتنے کے سبب، اردو ادب میں غلط تنقیدی نتائج کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن کی طرف ماہرینِ اردو بارہا توجہ دلا چکے ہیں۔ اس کے برعکس، جن ناقدین نے تحقیق کی بنیاد پر اپنی تنقیدات کا آغاز کیا، ان کے نتائج آج تک نہ صرف قابلِ ملاحظہ و قابلِ رشک ہیں بلکہ ان کے درجۂ استناد و اعتبار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مزید برآں اِس جدید انتقادی اسلوب سے بذاتِ خود اردو تنقید کا معیار بھی بلند ہوا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> '' تحقیق یہی کام کرتی ہے کہ وہ تنقید کی بنیادوں کو درست کر دیتی ہے۔ وہ فکر اور نتائج کو صحیح راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اگر اردو تنقید اپنی بنیاد، تحقیق پر قائم کرے اور ہمارے نقاد تحقیق وتنقید کو ملا کر ایک کر دیں تو اس سے نہ صرف اردو تنقید کا معیار و وقار بلند ہو جائے گا بلکہ تنقید وہ کام انجام دے سکے گی جو اس کا منصب ہے... ''[۱۹]

شاید یہی وجہ ہے کہ تحقیق سے معرّا، تنقیدی روایت میں اگر غور کیا جائے تو تعصّبات کے شاخسانے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اسی وجہ سے اردو ادب میں تنقیدی گروہ بندیوں اور خوامخواہ کی نفرتوں نے جنم لیا ہو۔ ہر ادبی حلقہ ساری ادبی وعلمی توانائیاں اپنے تنقیدی نظریات ہی کو درست ثابت کرنے پر صرف کرتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ تحقیق ایک ایسا حجرِ اسود ہے جو گروہی تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر محض نصب کرنے کی دیرینہ خواہش پر فنِ تنقید کو استوار کرسکتا ہے۔ جس میں اعتبار و وقار بھی ہے، اتحاد و یگانگت بھی ہے اور امتزاج کا تخلیقی آہنگ بھی۔ تحقیقی شعور سے گروہی تعصّبات کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ جب کہ بِلا تحقیق، تنقید؛ ادبی تعصّبات بڑھانے کا مؤثر ہتھیار ہے۔ مزید برآں اس حقیقت سے بھی ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب کی فطرت ہی انضمام و امتزاج سے معنون ہے۔ جیسا کہ جمیل جالبی بیان کرتے ہیں:

''ہماری تنقید کا روشن مستقبل، تحقیق و تنقید کو ملا کر ایک اکائی بنانے سے ہی ممکن ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی یہ کرنا چاہیے۔ نقاد و محقّق دونوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا ذہن ہر قسم کے مذہبی، علاقائی، ذاتی اور تاریخی تعصّبات اور مغالطوں سے پاک ہو، ورنہ صاحبِ تحقیق و تنقید غلط سمت کی طرف چلا جائے گا اور اس کا سارا کام بے بنیاد ہو جائے گا۔''[۲۰]

مذکورہ بالا اقتباس کا آخری جملہ قابلِ غور ہے۔ یعنی تعصّبات کی وجہ سے ایک نقاد راہِ راست سے بھٹک سکتا ہے اور نتیجتاً اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ درحقیقت گروہی تعصّبات سے انتشار جنم لیتا ہے اور اس کے برعکس امتزاج سے لمحہ بہ لمحہ ارتکازِ یک جہتی و یگانگت کا سفر طے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی جست بھرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ تحقیق و تنقید کے تخلیقی امتزاج کے ضمن میں اب تک جتنی بحث کی گئی ہے، اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے جدید انتقادی نظریات کا ایک حد تک مطالعہ کر کے اس کے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اب ایسی مثالوں کی ضرورت بھی ہے کہ جن کی روشنی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی عملی تنقید کا اندازہ ہو سکے۔ ورنہ یہ بحث نامکمل اور ناکافی رہے گی۔ اس بات کا جاننا نہایت ضروری ہے کہ جمیل جالبی تحقیق و تنقید کے جس تخلیقی امتزاج کی بات کر رہے ہیں، آیا انھوں نے خود اس پر کس حد تک عمل کیا ہے؟ اس حوالے سے چند ایک مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

''ہر بڑے شاعر کی طرح 'دیوانِ ولی' میں بھی بہت سے رنگ موجود تھے۔ ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق ولی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چن لیا... یہ بات ذرا دیر کو حیرت میں ضرور ڈالتی ہے کہ ایہام گوئی، ولی دکنی کا بنیادی رنگِ سخن نہ ہونے کے باوجود، کیسے شمال میں ریختہ کے عام رواج کے ساتھ، ایک غالب رجحان کی شکل اختیار کر گئی! یہ نظامِ قدرت ہے کہ موسم اور زمین کے مطابق فصل اُگتی ہے۔ گرمی کی فصل سردی میں اور سردی کی فصل گرمی میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو تہذیبی موسم اور معاشرتی زمین، شمال میں موجود تھی، اس میں ایہام گوئی کے رجحان کا پروان چڑھنا ایک فطری عمل تھا۔''[۲۱]

محولہ بالا اقتباس میں ولی دکنی (1667-1707) کے رنگِ سخن پر بات ہو رہی ہے۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کی روایت کے پروان چڑھنے میں ولی کے دیوان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کو نہایت گہرائی سے سمجھا کہ ایہام گوئی جو کہ ولی کا بنیادی رنگِ سخن نہ تھا، اس کا اثر شمالی ہند کی شاعری میں اتنا زیادہ کیوں ہوا؟ انھوں نے سماج، فنون اور کلچر کی تکون سے برآمد ہونے والے فن پارے کو شمالی ہند کی تہذیبی زمین، اس کی زرخیزی اور اس کی جاذبیت دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ ایہام گوئی اس معاشرے کی فطری ضرورت بن چکی تھی۔ اقتباس میں جو تنقیدی نتیجہ نکالا گیا ہے، اس کی بنیاد تحقیق پر رکھی گئی ہے اور اس تحقیق کے پیچھے سماجی، عمرانی، معاشی، اقتصادی اور سیاسی علوم کا ایک سلسلہ موجود ہے۔ اظہارِ بیان کے اس پیرائے میں تحقیق و تنقید کا بہترین

امتزاج دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت درج ذیل اقتباس میں موجود ہے:

''اُس دَور میں ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی، امرا، اکابرین اور خود بادشاہ، ساری معاشرتی و اخلاقی برائیوں میں ملوث تھے۔ ہر شخص اصراف پر زور دے رہا تھا۔ اس کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف تھا۔ ثنویت کا تضاد فرد کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ سارے معاشرے کو ہر چیز اور ہر بات کے دو رخ اور دو معنی نظر آ رہے تھے۔ وہی چیز اور وہی بات کامیاب تھی جس کے دو رخ تھے۔ اسی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی ماحول میں، فارسی شعرائے متاخرین کی طرح، نئے اردو شعرا بھی ایہام گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ رنگِ سخن اتنا مقبول ہوا کہ اردو شاعری کی پہلی ادبی تحریک بن گیا۔ ایہام گوئی کی بنیاد معنی یابی و تلاشِ مضمونِ تازہ پر رکھی گئی تھی اور اس میں یہ چھپی ہوئی خواہش بھی تھی کہ معنی، جو زندگی میں باقی نہیں رہے تھے، انھیں شاعری میں تلاش کیا جائے۔'' ۲۲

شمالی ہند کی تہذیب میں ایہام گوئی کا رجحان قبول کرنے کا فطری میلان کس طرح جنم لیتا ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی قدیم دور کے اُس معاشرے کا سیر حاصل مطالعہ کرنے کے بعد مذکورہ نتائج نکالتے ہیں۔ لاریب کہ کسی قدیم معاشرے کا مطالعہ محض شاعری پڑھنے یا ادبی نثر پڑھنے سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ غیر ادبی مواد کا مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ اور صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ اس مطالعے کا حاصل ایک منطقی ترتیب کا متقاضی بھی ہوتا ہے۔ محولہ بالا اقتباس کے مذکورہ نتائج کا بغور مطالعہ کرنے سے ایک بالغ نظر قاری تحقیق وتنقید کے امتزاج کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس امتزاج میں ایک طرح کا تخلیقی رنگ بھی موجود ہے اور یہی ڈاکٹر جمیل جالبی کی انفرادیت کا غماز ہے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال قابلِ ملاحظہ ہے:

''ہندی شاعری میں عورت؛ مرد سے اظہارِ عشق کرتی ہے۔ عربی شاعری میں مرد؛ عورت سے اظہارِ عشق کرتا ہے۔ فارسی شاعری میں مرد؛ اپنے جذباتِ عشق کا اظہار مرد سے کرتا ہے۔ خاقانی (1120-1190)، انوری (1126-1189)، سعدی (1210-1291)، حافظ (1315-1390)، ظہیر فاریابی (1156-1201)، امیر خسرو (1253-1325)، نظیری (متوفی: 1612ء)، صائب (1592-1676)، کلیم (1581-1651)، بیدل (1642-1720)، ناصر علی (ولادت: 1637)، جلال اسیر (1620-1639)، عبدالغنی قبول سب کے کلام میں اس نوع کے اشعار ملتے ہیں۔ لڑکوں سے عشق کرنا ایران میں عام تھا جس میں عوام و خواص اور شعرا سب ملوث تھے ... غرض کہ فارسی و اُردو تذکروں میں اس نوع کی عاشقی کے حوالے عام طور پر ملتے ہیں لیکن محمد شاہی دور (1719-1748) دور اَمرَد پرستی کی مقبولیت کا نقطۂ عروج تھا... دلچسپ بات یہ ہے کہ لڑکوں سے عشق کی ایک پوری روایت اس دور میں جنم لیتی ہے ... اس دور میں فنِ اَمرَد پرستی نے اتنی ترقی کی کہ نہ صرف استادی

> شاگردی کے رشتے قائم ہو گئے بلکہ لڑکوں کی سجاوٹ، وضع قطع، آرائش اور حسن و جمال کے طور طریقے بھی مقرر ہو گئے ... اس معاشرے نے امرد پرستی کیوں اختیار کی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مرد نے عورت کو باہر کی دنیا سے کاٹ کر چار دیواری میں بند کر دیا تھا۔ ہر بڑے گھر میں مردانے اور زنانے الگ الگ ہوتے تھے جن میں ہر طرح کی پردہ داری ہوتی تھی۔ پردہ دار عورت سے اظہارِ عشق کرنا نہایت معیوب اور بے غیرتی کی بات سمجھی جاتی تھی... ''[۲۳]

رقم کردہ مذکورہ اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ عشق و محبت کی جس روایت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، اس کی بنیاد تحقیق پر رکھی گئی ہے۔ اور حوالے کے طور پر نام ور فارسی شعرا کے نام بھی گنوائے گئے ہیں۔ اس کے بعد برصغیر کی معاشرتی زندگی کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے اور پھر کہیں جا کر تنقیدی نتائج نکالے گئے ہیں۔ اس پوری تحریر میں ترتیب کا ایک منطقی رنگ اور ربط و ضبط کی تخلیقی شان بہ خوبی جھلک رہی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اور تاریخ ہی نہیں بلکہ ان کے ہر مضمون میں امتزاج کا یہ تخلیقی رنگ آخر تک موجود رہتا ہے۔ اگرچہ جامعات میں اردو ادب کے نصاب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو بہ طور نقّاد متعارف نہیں کرایا جاتا اور اساتذہ انھیں بہ طور محقق و مدون اور تاریخ نویس ہی پیش کرتے ہیں تاہم اردو ادب کے معروف ناقدین نے اُن کی اِس امتزاجی جہت کو نہ صرف شناخت کیا ہے بلکہ سراہا بھی ہے۔ ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر سلیم اختر (1934-2018) کا ہے۔ چناں چہ وہ جمیل جالبی کے جدید انتقادی اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے لیے خاصا کڑا معیار مقرر کیا ہے، ایسا معیار جسے اکثریت نے بھاری پتھر سمجھا اور محض چوم کر چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق، کلچر اور تنقید کے امتزاج سے درست نتائج اخذ کرنے کے لیے جہاں تحقیق میں محنت اور فراہمیِ مواد کے لیے دقتِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں ایسی نگاہ بھی درکار ہوتی ہے جو منتشر، متناقص اور متنوع ادبی تغیرات کے ساتھ ساتھ ادبی روایات و مسلّمات، عصری میلانات اور تہذیبی رویوں میں شیرازہ بندی بھی کر سکے۔ اس مقصد کے لیے ادبی مؤرخ کے پاس تخلیقی ذہن، تخلیقی نگاہ اور اس کے ساتھ رد و قبول کی بھرپور صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔''[۲۴]

فکری تنقید کا یہی کڑا معیار سہل پسند طبیعتیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس میں سحر خیزی بھی ہے اور دماغ سوزی بھی ___ روایتوں کی تلاش بھی ہے اور ان کا انسلاک و انضمام بھی ___ معاشرتی اقدار کا افتراق بھی ہے اور تنوعات کا امتزاج بھی ___ علوم و فنون کا ادراک بھی ہے اور ان کا عملاً انتقاد بھی۔ غرض یہ کہ جس طرح سورج کی تمام شعاعیں اگر ایک نقطے پر جمع ہو جائیں تو تپش کی حِدّت بڑھ جاتی ہے، اسی طرح متنوع علوم و فنون کی شعاعوں کو مرکوز کرنے سے تنقیداتِ جالبی کی تخلیقی حِدّت بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس تیزی میں ایک توازن بھی ہے اور بردَوَّ سلما کی ٹھنڈک بھی۔ اردو ادب میں ایک طرف تو ڈاکٹر جمیل جالبی کے انتقادی اسلوب کا بیان کردہ

جدید اور قابلِ تقلید احوال تھا اور دوسری طرف روایتی تحقیق وتنقید کے ادارے تھے! اس ضمن میں سلیم احمد کا تبصرہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتا ہے:

> ''ہمارے یہاں ادب وعلم کے شعبوں میں ایک بڑا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والے اپنے زمانے کی تخلیقی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے اور وہ لوگ جو تخلیقی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں علمی اور تحقیقی سرگرمیوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ کئی بار تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان دونوں شعبوں کے درمیان ایک طرح کی مخاصمت پائی جاتی ہے ... جمیل خاں اپنی ذات سے غالباً تنہا آدمی ہیں جنھوں نے اس خلیج کو پاٹنے کی زبردست کوشش کی ہے۔'' ۲۵

ڈاکٹر جمیل کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے قدیم اردو کی پہلی معلوم تصنیف یعنی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (1421-1435) کی باقاعدہ قرأت کی، اس کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا اور تحقیقی کھوج سے اس کی حقیقت واشگاف کی۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (1913-1978) اُن کی اس تحقیقی وتنقیدی کاوش کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ اردو کی اُس پہلی تصنیف کو قبر سے کھود کر ہی نہیں نکال لائے بلکہ زندہ کر کے کھڑا کر دیا۔ اصل سائنٹیفک تنقید اس قسم کی تحقیق ہے جو کدم راؤ پدم راؤ کے سلسلے میں جمیل جالبی نے پیش کی ہے۔'' ۲۶ قبر سے کھود کر نکالنے سے مراد یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی کے اصل مآخذ تک پہنچ گئے ہیں اور اس میں ان کا جدید انتقادی وامتزاجی شعور بھی برابر شامل رہا ہے۔ جب کہ زندہ کر کے کھڑا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے اس کا ''نئی تنقید'' کی روشنی میں جائزہ لے کر چونکا دینے والے نتائج مرتب کیے ہیں۔ اس ضمن میں جمیل جالبی خود لکھتے ہیں: ''وسیع مطالعے سے ایک طرف مختلف علوم وفنون اور فکر وفلسفہ جذب ہو کر آپ کی تحریروں کو وسعت دیں گے اور دوسری طرف بہت سی ایسی باتوں کی تصدیق بھی غیر ادبی ماخذ سے ممکن ہو سکے گی جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔'' ۲۷

ایک مصاحبے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا تھا: ''قیاس کو منطق کی بنیاد پر کھڑا کرنا چاہیے۔ اصل مآخذ سے براہِ راست رجوع کرنا چاہیے اور غیر ادبی مآخذ کو بھی استعمال کرنا چاہیے تاکہ نئی روشنی اور علم کے نئے پہلو 'تحقیق' میں شامل ہو سکیں۔'' ۲۸ یہ جو غیر ادبی مآخذ کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادبِ اردو میں روایت کی مختلف کڑیاں جوڑنے میں ان سے بہت مدد لی ہے۔ اور یہی ایک نابغہ محقق کی اصل پہچان ہے کہ وہ علوم وفنون کے ہر مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حوالے سے جمیل جالبی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ اعتراف بھی اہم ہے: ''... سچے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سچے عالم بھی ہیں۔ انھوں نے تخیل کے ساتھ ساتھ تحقیق کی کوہ کنی بھی کی ہے۔ 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ تخیل وتحقیق وتنقید کا یہ اجتماع ایک نادر بات ہے۔'' ۲۹ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید (1928-2016) اُن کی ناقدانہ بصیرت کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''وہ فن پارے سے ادبیت کے داخل کا کھوج لگاتے ہیں اور بالعموم اس رائے کو اہمیت نہیں دیتے ہیں جو زباں زدِ خاص وعام ہے یا سِکّۂ رائج الوقت بن چکی ہے۔ تنقید اُن کے ہاں اظہار

کاایک ایسا میڈیم ہے جو عملِ جرّاحی کے برعکس تلاشِ حقیقت کرتا ہے۔'' ۳۰؎ گویا عملِ جراحی بھی ایک طرح کا تنقیدی عمل ہے لیکن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے؛ یہ فن پارے کو چیرنے پھاڑنے کا عمل ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا (1922-2010) نے ایک دفعہ کہا تھا کہ نقّاد کو فن پارے کی طرف بت شکن کی طرح نہیں بڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ فن پارے کے کرب تک پہنچنے کے لیے جلّادی طبیعت کے بجائے نیازمندانہ مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ تلاشِ حقیقت دراصل موئن جو ڈارو دریافت کرنے کا نام ہے، ریزہ ریزہ اکٹھا کر کے پھر سے ڈائنو سار تخلیق کرنے کا عمل ہے۔ مزید برآں ڈاکٹر جمیل جالبی کے انتقادی اسلوب کے ضمن میں افسر صدیقی امروہوی (1896-1984) کا دیوانِ حسن شوقی کی زبان و بیان پر یہ تبصرہ بھی قابلِ غور ہے:

> ''ترک و اختیار، تراش وخراش اور حَک و اصلاح کی متعدد منزلوں سے گزر کر موجودہ صاف، رواں اور شستہ زبان کی صورت اختیار کی ہے۔ اس اعتبار سے کئی صدیاں پہلے کے کسی شاعر کے خیالات کو سمجھنا اور ان کے اظہار کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان کے مفہوم تک پہنچنا کس قدر دشوار کام ہے؟ اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں اس وادیِ پُر خار سے گزرنے کا اتفاق ہُوا ہو... ''۳۱؎

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فن پاروں کو پرکھنے کے لیے تحقیقی بصیرت کو بہ طور تکنیک استعمال کیا ہے، جسے فنِ تنقید میں نیا لیکن مشکل زاویۂ نگاہ کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً؛ جس طرح کسی مخطوطے میں محض داخلی شواہد کی مدد سے مخطوطہ نگار کے حالاتِ زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اسی طرح انھوں نے فن پاروں کے داخلی شواہد کی مدد سے تہذیبی و ثقافتی حوالے بھی تلاش کیے ہیں اور سماجی زندگی کے بہت سے مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ تنقید نگاری میں یہی اسلوب ڈاکٹر جمیل جالبی کی انفرادیت کا غماز ہے۔ علاوہ ازیں دفینوں سے دریافت کردہ مواد کی کڑیاں تلاش کرنا شاید اتنا اہم نہیں! سب سے اہم تو یہ ہے کہ تلاش شدہ کڑیوں کو جوڑ جوڑ کر ایک ڈائنو سار تخلیق کر لیا جائے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی (18 جون 1939ء۔۔۔) کہتے ہیں: ''جالبی صاحب کو مختلف واقعات کی کڑیاں جوڑنے اور ان میں منطقی ربط پیدا کرنے کا سلیقہ آتا ہے اور یہی ایک اچھے محقق کا بنیادی وصف ہے... عہدِ خلجی سے لے کر طوائف الملوکی تک کوئی کڑی غیر مربوط نظر نہیں آتی۔''۳۲؎ تلاش کی گئیں کڑیوں کو اس طرح آپس میں مربوط کرنا کہ کوئی نقشہ یا تصویر بن جائے یا کوئی کہانی مرتب ہو جائے، اسی اسلوب کو تخلیقی تنقید کہتے ہیں اور منصۂ شہود پر آنے والی ہر تخلیقی تنقید کا اپنا ایک الگ رنگ، الگ خوشبو اور الگ مزاج ہوتا ہے۔ بہ قول پروفیسر ریاض صدیقی (1938-2006): ''ڈاکٹر جمیل جالبی کی نثر میں تحقیق و تنقید کے لیے بہترین بیانیہ زبان، تخلیقی رنگوں کو اس طرح چھو کر گزرتی ہے جس طرح پھولوں سے بھرے ہوئے باغ میں ہوا اور خوشبو باہم مل کر ایک خوشگوار سرور کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔''۳۳؎ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیق و تنقید کے تخلیقی امتزاج کے عمل Process کو سمجھنے کے لیے چند ایک تصاویر سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اب اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ گم شدہ کڑیوں کی تلاش و جستجو کے عمل میں تحقیق ہمیشہ آگے رہتی ہے جب کہ تنقید اس کی راہ نمائی کر رہی ہوتی ہے۔ اس عمل کو درج ذیل تصویر کی مدد سے بہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(تصویر نمبر ۱)

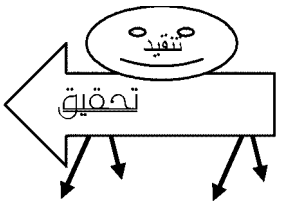

جب مختلف حالات و واقعات کی چند کڑیاں تلاش کر لی جاتی ہیں تو اس کے بعد انھیں جوڑنے اور ملانے کا عمل شروع ہوتا ہے جو نوعیت کے اعتبار سے پہلے عمل کے مخالف لیکن جہت کے لحاظ سے مماثل ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس وقت تنقید آگے ہو جاتی ہے اور تحقیق اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ اس کی مثال درج ذیل تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(تصویر نمبر ۲)

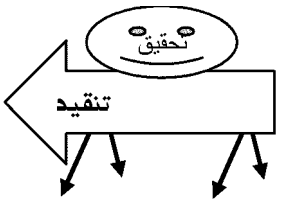

مذکورہ دونوں تخلیقی عوامل الگ الگ ہونے کے باوجود باہم مربوط بھی رہتے ہیں۔ یہی ارتباط دراصل امتزاج میں متشکل ہوتا رہتا ہے۔ تشکیل کا یہ عمل بالآخر تخلیق پر منتج ہو جاتا ہے جسے درج ذیل تصویر سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(تصویر نمبر ۳)

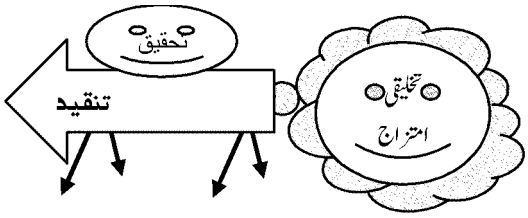

مذکورہ تصاویر کے تناظر میں ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ (2/اپریل 1966۔۔۔) کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے:

> ''خود ڈاکٹر جالبی کے ہاں تنقید؛ تحقیق کے حسنِ آہنگ سے رنگ کشید کرتی ہے اور تنقید کا اسلوب؛ تحقیق کے حسنِ خیال سے معنی کی رعنائی کا ایک ایسا خزینہ دریافت کرتا ہے جو ہر دو کو ایک دائرے میں لا کر ایک ایسا امتزاجی آہنگ مرتب کرتا ہے جو تحقیق اور تنقید دونوں کی وسعت آشنائی کی دلیل بھی ہے اور ان کی تازگی اور شادابی کا آئینہ دار بھی... اس امتزاجی آہنگ سے اس معنوی اکائی کی تلاش اور شناخت آسان ہو جاتی ہے جسے جزئیات میں بانٹ کر دیکھنا ممکن

نہیں ہوتا۔'' [۳۴]

مذکورہ بالا اقتباس کا آخری جملہ اہمیت کا حامل ہے۔ گویا جمیل جالبی کے تخلیقی امتزاج سے معنویت کے نئے در بھی وا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تنقید کے کسی بھی نئے نظریاتی دیار میں معنویت کی نئی سطحیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے تنقیداتِ جالبی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ جمیل جالبی کے اسی تخلیقی امتزاج کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی یوں لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی تحریروں میں تحقیقی اور تنقیدی اسالیب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے نثر میں ایک تخلیقی مزاج پیدا ہو گیا ہے۔ اس تخلیقی رویے نے ان کی تحریر میں ایسی رونق اور زیبائی پیدا کر دی ہے کہ بظاہر خشک سے خشک موضوع، ان کے ہاں پُر کیف نظر آنے لگتا ہے۔ جالبی صاحب نے تحقیق اور تنقید میں اتصال اور ہم آہنگی کو اس طرح فروغ دیا ہے کہ ان کے ہاں تنقیدی فکر سے تحقیق کی صورت گری ہوئی ہے اور تحقیق کے ذریعے تنقید کو درجۂ اسناد ملا ہے۔'' [۳۵]

تحقیق و تنقید کے تخلیقی امتزاج کے پیشِ نظر اہلِ علم کی طرف سے یہاں یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ جدید رجحان کے مطابق تو ایک شعبۂ علم سے مزید شاخیں پھوٹ رہی ہیں اور آج تک یہی ہوتا آیا ہے کہ فلسفہ ایسے قدیم علم سے مزید کئی شاخیں نکل آئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تمام نئے علوم نے انفرادی طور پر اپنا ایک الگ سے تشخص بھی قائم کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا انکشافات کی طرف بڑھ رہی ہے نہ کہ ارتکازات کی طرف! ____ لہٰذا، تحقیق و تنقید کا امتزاج؛ علوم و فنون کے جدید رُجحانات اور اسلوبِ ارتقا کے بالکل برعکس ہے۔ یہ سوال اُنھیں لوگوں کے ذہن میں آ سکتا ہے جو تحقیق و تنقید کی اصل ماہیت سے بے خبر ہیں۔ دراصل ڈاکٹر جمیل جالبی رَدِّ تشکیل جیسے فلسفے کے موید نہیں ہیں اور نہ ہی وہ فنِ تنقید اور فنِ تحقیق پر خطِ تنسیخ پھیر کر اِن کا امتزاج چاہتے ہیں۔ وہ تو اِن دونوں کی روشنی میں، لیکن ان سے علاحدہ ایک نئے فن کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اسی لیے وہ اِسے ''نئی تنقید'' کا نام دیتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ''نئی تنقید'' میں صرف تحقیق و تنقید کا امتزاج نہیں بلکہ دنیا بھر کے علوم و فنون کا امتزاج ہے۔ تاہم غلبے کے اعتبار سے تحقیق و تنقید نمایاں ہیں اور اس تخلیقی امتزاج کی سب سے بڑی عملی مثال ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو ہے جس کے بارے میں مشفق خواجہ (1935-2005) کا یہ اعتراف کسی اعزاز سے کم نہیں ہے:

''تحقیق کے ساتھ ساتھ اس تاریخ ادب اردو کا تنقیدی معیار بھی بہت بلند ہے۔ جمیل جالبی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے مزاج کو تحقیق و تنقید دونوں سے یکساں مناسبت ہے۔ اسی بنا پر میرے نزدیک تاریخِ ادب لکھنے کا استحقاق ان سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ یہ کام کوئی ایسا شخص صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا جو صرف محقّق یا صرف نقّاد ہو۔ تحقیق کے ذریعے کسی شے کو تلاش کیا جاتا ہے اور تنقید کے ذریعے اسے پرکھا جاتا ہے، اس کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے ... جمیل جالبی کی یہ خوبی ہے کہ وہ شے کو تلاش بھی کر لیتے ہیں اور اسے پرکھ بھی سکتے

ہیں۔ ان کے ہاں تحقیق وتنقید ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تحقیق سے ان کی تنقید نکھرتی ہے اور تنقید سے ان کی تحقیق میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔''[۳۶]

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک نئے فن کی بنیاد رکھی ہے جسے شاید اب تک سمجھا نہیں جا رہا۔ تحقیق وتنقید کا امتزاج ممکن ہے یا نہیں؟ بہر حال انھوں نے یہ کر دکھایا ہے۔ بقول مختار زمن (1923-2003):

''اس کتاب تاریخ ادبِ اردو نے تحقیق وتنقید کی نئی کھڑکیاں کھول دی ہیں جس سے تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے۔''[۳۷] اس جدت طرازی پر انھیں قابلِ تحسین جاننا ایک الگ بات ہے۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھوں نے جس فن کی بنیاد رکھی ہے اور جس کی ترویج کے لیے عملی اقدام بھی اٹھایا ہے، اسے پروان چڑھایا جائے، اس کے رموز سمجھنے کے لیے لائحہ عمل وضع کیا جائے اور اردو ادب میں اس تخلیقی امتزاج کے مزید تجربات کیے جائیں تا کہ اردو ادب کے وقار و اعتبار میں مزید اضافہ ہو سکے۔ ڈاکٹر عتیق اقبال نے بھی تاریخ ادبِ اردو کے اس منفرد تخلیقی اسلوب کا نہایت واشگاف الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی کو مختلف واقعات کی کڑیوں کو جوڑنے اور ان میں منطقی ربط پیدا کرنے کا سلیقہ آتا ہے اور یہی ایک اچھے محقق کا معیاری وصف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شواہد کی مکمل چھان بین کے بعد جب تک خود مطمئن نہ ہو جائیں قارئین تک بات منتقل نہیں کرتے۔ یہ ان کے اندازِ تحقیق کی ایک اور نمایاں خوبی ہے جو انھیں اردو کے دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے اندر تحریر کی شگفتگی اور ادبی پن ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں تحقیقی اور تنقیدی اسالیب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۳۸]

بہر حال یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ تحقیق وتنقید اور دیگر علوم کے تخلیقی امتزاج کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظری و اطلاقی کوششیں اپنی جگہ مستحسن سہی لیکن فنِ تنقید اور فنِ تحقیق کی انفرادی روایتوں کا دائرۂ کار اور ان کا تسلسل کسی بھی طرح ختم نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ منشا رہی ہے۔ یہ دونوں فنون اپنے پورے لوازمات کے ساتھ آج تک اسی طرح موجود ہیں۔ ان روایتوں کے حاملین و موید ین نے جب کبھی اپنی فکری دوربین سے تحقیق وتنقید کے تخلیقی امتزاج کو دیکھا ہے تو انھیں یہ امتزاج خوش نہیں آیا۔ اسی طرح جب انھوں نے تنقیداتِ جالبی کو اپنے مخصوص چوکھٹے میں لگا کر دیکھنا چاہا تو انھیں اس کا کوئی بھی کل سیدھا نظر نہیں آیا۔ لہٰذا، انھوں نے اسے یک سر مسترد کر دیا۔

اس حوالے سے رشید حسن خان (1930-2006) کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ رشید حسن خان ایک اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔ اگر چہ ان کے تحقیقی کام اور تحقیقی آرا کو اہلِ علم و ادب قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم علم و ادب میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوسکتی۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مشرقی ومغربی ادب کی روایات سے جس قدر ڈاکٹر جمیل جالبی روشناس ہو چکے تھے، رشید حسن خان اتنے واقف نہیں تھے۔ نیز کلچر کا جو مفہوم ڈاکٹر جمیل جالبی نے متعین کیا ہے وہ بھی رشید حسن خان کے لیے شاید قابلِ قبول نہ ہو۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ جس قدر ڈاکٹر جمیل

جالبی نے مخطوطات کا مطالعہ کیا ہے، شاید اُتنی مقدار رشید حسن خان کے مطالعے میں نہیں آ سکی۔

حافظ محمود شیرانی (1880-1946) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مخطوطے کا کاغذ دیکھ کر اس کی قدامت کا تعین کر لیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی فن کی مسلسل مشق سے علم کے کئی دریچوں کا انکشاف خود بخود ہونے لگتا ہے۔ اس سے یہ استنباط بھی کیا جا سکتا ہے کہ وسعتِ مطالعہ کی وجہ سے نقد و نظر کے کچھ پیمانے ڈاکٹر جمیل جالبی کی فکر کا باقاعدہ حصہ بن گئے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت جلد نتائج تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں تحقیق و تنقید کے تخلیقی امتزاج کی یہ سب سے اعلیٰ صفت ہے کہ ادبی روایت کی زنجیر کی کڑی سے کڑی خود بخود ملنے لگتی ہے اور اس طرح یہ تخلیقی عمل اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

بہرحال اس امتزاجی فن کا سہرا ڈاکٹر جمیل جالبی کے سر ہی جاتا ہے، کیوں کہ نقد و نظر کا یہ پیمانہ صرف فنِ تحقیق یا محض فنِ تنقید کے معیار پر شاید پورا نہیں اتر سکتا۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ (1990) میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو پر بہت سے اعتراضات اٹھائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے غیر معتبر کتابوں سے حوالے دیے ہیں۔ ایسی کتابوں سے جو متعلقہ ادیب سے قریب العصر نہیں اور یہ کہ تحقیق میں تنقید نہیں کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اُن کے اِن اعتراضات کا جواب ڈاکٹر گیان چند جین (1923-2007) نے نہات ادبی و اعلیٰ پیرائے میں دیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات اس بحث کا حصہ بنانا بھی ضروری ہیں تاکہ بات ادھوری نہ رہ جائے۔ چناں چہ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اگر ہمیشہ اصلی ماخذ کو دیکھ کر حوالے دیے جائیں تو سال بھر میں دس صفحے سے زیادہ لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ اگر محض ہم عصر یا قریب العصر راوی کے بیان پر اصرار کیا جائے تو اردو ادب یا دنیا کے کسی بھی ادب کا معتد بہ ابتدائی حصہ خارج کر دینا ہوگا۔ کیا رامائن، مہابھارت، کالی داس کی تصانیف، ایلیڈ، اوڈیسی اور دوسرے یونانی شاہ کاروں کے قریب العصر نسخے موجود ہیں؟ ان سب کا قدیم ترین نسخہ مصنف سے کئی صدیوں بعد کا ہے۔ کیا انھیں حرفِ غلط قرار دیا جائے؟ قدیم اردو ادب کے ان قدیم مخطوطوں کو لیجیے جن کے مصنف، مرتب، کاتب، سنہ تصنیف یا سنہ کتابت میں سے کئی شناختوں کا علم نہیں۔ اہلِ حزم و احتیاط کا فرمان ہوگا کہ ان کا ایک حرف بھی قبول نہ کیا جائے لیکن ایسا کیا گیا تو آئندہ کے لیے قدیم اردو ادب میں، ایک نظم، ایک نثر، ایک شعر ایک سطر کا اضافہ ممکن نہ رہے گا۔ کئی دکنی ادیبوں کی تصانیف کا قدیم ترین نسخہ ان کے عہد سے کافی بعد کا ہے۔ کیا اسے نظر انداز کر دیا جائے؟ جس طرح یہ غلط ہے کہ قدیم تحریر کو اصلی مان کر تسلیم کر لیا جائے، اسی طرح یہ بھی نامناسب ہے کہ ہر مجہول الاسم قدیم مخطوطے یا بیاض کے مشمولات کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا جائے ... میری نظر سے ایسے متعدد دکنی مخطوطے گزرے ہیں جن کے نام، مصنف، سنہ، تصنیف اور سنہ کتابت میں سے کسی کا علم نہیں، کیا اس

سارے خزانے کوردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے؟ میری رائے میں محقق کو ہر مجہول نسخے کا داخلی رنگ و آہنگ دیکھ کر طے کرنا ہوگا کہ یہ کہاں تک قابلِ اعتماد ہے۔''[۳۹]

محولہ بالا طویل اقتباس میں ڈاکٹر گیان چند جین نے جو سوالات اٹھائے ہیں وہ غور طلب ہیں۔ کیا اردو سے محبت کرنے والا کوئی بھی فرد یہ ہمت کر سکتا ہے کہ اعلیٰ پائے کے فن پاروں کو محض اُن کے مصنف، مقام اور زمانے کی نایابی کی وجہ سے دریا برد کردے؟ نامعلوم مخطوطے کی شناخت کا ایک اور طریقہ بھی ہوسکتا ہے کہ بار بار اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ اس مخطوطے کا تخلیقی آہنگ ایک قاری محقق کے دل و دماغ میں بیٹھ جائے۔ اس کے بعد قیاساً قریب العصر دیگر مخطوطوں کا مطالعہ کر لیا جائے۔ اُس دور کی معاشرت کا تاریخی جائزہ لیا جائے۔ ادب کے علاوہ دوسرے علوم سے مدد لی جائے۔ یہی تحقیق وتنقید کے امتزاج کی سطح ہے۔ اس کے بعد وہ مقام خود بخود آ جاتا ہے، جب کڑی سے کڑی ملنے لگتی ہے اور خفتہ وخوابیدہ رموز سطح پر آ کر ہم کلام ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بالآخر وہ لمحۂ تخلیق آ جاتا ہے کہ مفکر نقّاد درست فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

''یہ بہت ممکن ہے کہ جالبی نے بیاضوں سے جو نمونے درج کیے ہیں، ان میں سے بعض معتبر نہ ہوں لیکن ان کی زبان کے معیار کو دیکھ کر انھیں غیر معتبر قرار دیجیے۔ شمالی ہند کے، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور کے جو شعری نمونے پیش کیے جاتے ہیں، ان کی زبان کو سختی سے جانچیے۔ ان میں سے بیش تر نامعتبر ٹھہریں گے لیکن یہ فیصلہ ان کی زبان و بیان کی بنا پر کیا جائے گا۔ اس بنا پر نہیں کہ یہ سب سے پہلے جس نسخے میں ملے ہیں، وہ مصنف سے قریب العصر نہیں یا ان کے عہدِ کتابت کا علم نہیں۔''[۴۰]

اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ اگر رشید حسن خان کے تحقیقی اصول کو حتمی مان لیا جائے تو عالمی ادب کے بہت سے علمی سرمائے پر خطِ تنسیخ پھیرنا پڑے گا، لیکن ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ اردو ادب میں دستیاب معلوم ذرائع ہی کو چھان پھٹک کر مرتب کرنا ہوتا ہے اور اس میں تخلیقی و امتزاجی رنگ بھرنا ہوتا ہے تاکہ اردو زبان و ادب سے وابستہ لوگوں کی تسکینِ جاں کا وافر بندوبست ہو سکے۔ اور یہی کچھ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ علم و ادب میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوتی بلکہ ہر آن غور وخوض کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ ادبی و معاشرتی علوم کے تحقیقی پیمانے حالات و واقعات کے مطابق تبدیل ہو سکتے ہیں اور تبدیل ہوتے بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ کہنا صائب معلوم ہوتا ہے:

''اگر ہم قدیم ترین دور کے لیے عہدِ وُسطیٰ اور عہدِ حاضر کے پیمانوں کا مطالبہ کریں تو عہدِ قدیم کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح ہمیں ادبیات کے قدیم نمونوں کو، ان کے داخلی رنگ و آہنگ کی بنا پر پرکھنا ہوگا اور اس کے بعد بھی ہم انھیں اس طرح سو فی صد وثوق کے ساتھ قبول نہیں کر سکتے جتنا بعد کے نمونوں کو لیکن ہم انھیں نظر انداز بھی تو نہیں کر سکتے۔ میں جالبی صاحب کی کھوج کی قدر کرتا ہوں۔''[۴۱]

رشید حسن خان نے تاریخِ ادبِ اردو پر ایک اعتراض ان کے حوالوں کی اسناد کے بارے میں بھی کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے زیادہ تر ثانوی حوالوں پر تکیہ کیا ہے۔ حالاں کہ ڈاکٹر جمیل جالبی خود اس کا بار بار اقرار کر چکے ہیں کہ وہ حتی المقدور اصل ماخذ تک پہنچے ہیں، بے شمار مخطوطات کا مطالعہ کیا ہے اور ان سب کے حوالے انھوں نے نقل بھی کیے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ''میں مبہوت ہو کر ایک عالمِ حیرت میں ہوں، جالبی نے نمونے درج کرتے وقت کس کثرت سے اصل ماخذوں کو دیکھا ہے۔ جو متون شائع ہو گئے ہیں، ان کے بھی مخطوطوں کو ٹٹولا ہے اور پھر لیجیے صوفیا کے تذکروں اور گجرات و دکن کی سیاسی تاریخوں کو۔ ان کے مندرجات کو بھی انھوں نے دوسری کتابوں سے نقل نہیں کیا بلکہ اصل کتاب سے لیا ہے۔ فٹ نوٹوں کی سیر کیجیے، کس کثرت سے اصل ماخذوں کا صفحہ وار حوالہ موجود ہے۔ ان ماخذ کی بنا پر میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ اردو ادب کے جس قدر تخلیقی اور تحقیقی کام ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گزرے ہیں، اتنے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گزرے۔ دکنی ادب کے جتنے مخطوطات میں وہ ڈوب چکے ہیں اتنا کوئی معاصر محقق نہیں ہو سکا۔''[۴۲]

محاکمہ/خلاصہ

تحقیق و تنقید کے حوالے سے کی گئی اب تک کی تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو فنِ تنقید میں روایتی روش سے ہٹ کر ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ ان کی تنقیدات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی نظریاتی اور اطلاقی تنقید میں تضاد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جدید نقّاد کے لیے انھوں نے باقاعدہ ''نئی تنقید'' کا نصب العین تیار کیا ہے۔ اس نصب العین پر انھوں نے سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھایا ہے۔ ان کی تنقیدات کا سب سے بہترین نمونہ ان کی ''تاریخِ ادبِ اردو'' ہے۔ وہ تحقیق و تنقید کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تحقیق، تنقید، لسانیات اور دیگر سماجی علوم و فنون کے امتزاج ہی سے تخلیقی و فکری تنقید نگاری ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ محض تحقیق و تنقید کے امتزاج کے حامی نہیں بلکہ وہ غیر ادبی علوم کے انضمام پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک فکری نقّاد کو سائنسی و سماجی علوم سے بھی استفادہ کرتے رہنا چاہیے۔ جتنا مطالعہ زیادہ ہو گا فکری نقّاد کی تنقیدی بصیرت میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔ وہ کسی فن پارے کی تنقید نگاری کے لیے تحقیق کی بنیاد فراہم کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ درست نتائج حاصل ہو سکیں۔ ان کے نزدیک تحقیقی عمل، تنقیدی شعور کے بغیر کم زور قرار پائے گا اور اسی طرح تنقیدی عمل بھی تحقیقی شعور کے بغیر بے معنی ہو گا۔ کلچر ان کا محبوب ترین علمی و فنی حربہ ہے اور وہ اس کا ایک وسیع مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ وہ کلچر کو تہذیب یا ثقافت کے متبادل خیال نہیں کرتے بلکہ ان دونوں کے امتزاج کو کلچر کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کلچر کے ساتھ جدید علوم کا امتزاج بھی چاہتے ہیں۔ کلچر کے موضوع پر پاکستانی کلچر (1964) ان کی بہترین کتاب ہے۔ وہ امتزاج کے سرخیل ہیں اور اسی فن کی بدولت وہ بہت

سی معاشرتی اقدار کا تعین بہ آسانی کر لیتے ہیں۔ اسی فن کی بدولت وہ سماجی مسائل تک پہنچ جاتے ہیں اور معاشرے کی بے راہ روی کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک فکری نقّاد کے لیے مشرقی و مغربی روایت کا کماحقہٗ علم ہونا بے حد ضروری ہے۔ اردو ادب کی روایت جاننے کا مستند حوالہ ان کی تاریخِ ادبِ اردو اور مغربی ادبی روایت جاننے کے لیے ان کی ارسطو سے ایلیٹ تک بہترین علمی و ادبی سرمایے ہیں۔ درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تنقیداتِ جالبی کی اور بھی فنی جہات کا انکشاف ممکن ہوسکتا ہے۔

حوالے/حواشی

۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''دیوانِ حسن شوقی''، مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، محمد خاور جمیل، ڈاکٹر، (مرتب)۔ کراچی: الیٹ غغ پبلشرز، 2016، ص526

۲۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''اردو تحقیق پر ایک مصاحبہ''، مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص41/ 540

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ص546

۵۔ ایضاً، ص41/ 540

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، مشمولہ: دیوانِ نصرتی، لاہور: قوسین، بارِاول: 1972ء، ص:2

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، مشمولہ: ارسطو سے ایلیٹ تک، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، بارِہفتم: 2003، ص29

۸۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق''۔ مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص515

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ ''تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول''۔ مشمولہ: نئی تنقید، مرتبہ؛ خاور جمیل، کراچی: رائل بک کمپنی، بارِاوّل: 1985، ص23

۱۰۔ سلیم احمد، ''جمیل میرے دوست''، مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص359

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اقتباس''، مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص492

۱۲۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، ''جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو''۔ مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص201/ 202

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ ''روایت اور جدیدیت''، مشمولہ: ادب کلچر اور مسائل، مرتبہ؛ خاور جمیل، کراچی: رائل بک کمپنی، بارِاول: 1986ء، ص: 69

۱۴ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ ''نئی تنقید کا منصب''۔مشمولہ:نئی تنقید، مرتبہ؛ خاور جمیل، ص 46/47
۱۵ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ '' گفتگو۲، میزبان: اطہر نفیس''، مشمولہ:ادب کلچر اور مسائل، مرتبہ؛ خاور جمیل، ص 413
۱۶ ایضاً، ص 414
۱۷ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول''۔مشمولہ:نئی تنقید، مرتبہ؛ خاور جمیل، ص 66
۱۸ ایضاً
۱۹ ایضاً، ص 69
۲۰ ایضاً ، ص 72
۲۱ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو، جلد:۲، حصہ:اوّل، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، بارِاوّل: 1982ء، ص 154/155
۲۲ ایضاً، ص: 155
۲۳ ایضاً، ص: 160
۲۴ سلیم اختر، ''اردو دیس کا سیاح''۔مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی- ایک مطالعہ، مرتبہ؛ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، لاہور: ادارۂ فروغِ اردو، بارِاوّل: 1993ء، ص 191
۲۵ سلیم احمد، ''جمیل میرے دوست''۔مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص 358
۲۶ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''جمیل جالبی کی تنقید نگاری''۔مشمولہ: ڈاکٹر جمیل جالبی- ایک مطالعہ، ص 165
۲۷ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول''۔مشمولہ:نئی تنقید، ص 64
۲۸ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''اردو تحقیق پر ایک مصاحبہ''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص 537
۲۹ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اقتباس''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص 492
۳۰ انور سدید، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص: 474
۳۱ افسر صدیقی امروہوی، ''دیوان حسن شوقی''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص: 416
۳۲ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص: 508
۳۳ ریاض صدیقی، پروفیسر، ''تاریخ ادبِ اردو: ایک مطالعہ''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص: 639
۳۴ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، بارِ اوّل: 2007ء، ص: 77

۳۵ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کا اندازِ تحقیق''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص513

۳۶ مشفق خواجہ، ''اردو ادب کی پہلی تاریخ''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص580

۳۷ مختار زمن، ''ڈاکٹر جمیل جالبی''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص52

۳۸ عتیق اقبال، ڈاکٹر، ''کثیر الجہات شخصیت ڈاکٹر جمیل جالبی''، مشمولہ:ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص:129

۳۹ گیان چند، ڈاکٹر، ''جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو- ایک جائزہ''، ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ص:14/613

۴۰ ایضاً، ص:614

۴۱ ایضاً، ص:617

۴۲ ایضاً، ص:615